

دھول بن

سامنے کی جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی اور میرے قدم رک گئے۔ سرسراہٹ پھر ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ جھاڑی میں سانپ ہے۔ سانپ سے میں پہلے بھی بہت ڈرتا تھا اور اب تو مجھے ایک بار سانپ کاٹ چکا تھا۔ کوئی زہریلا سانپ تھا اور میں مرتے مرتے بچا تھا۔ سانپ کا ڈسا ہوا آدمی اس کیڑے سے کتنا ڈرنے لگتا ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کو کم سے ایک بار زہریلا سانپ کاٹ لیتا ہے۔ اسے ہر جگہ سانپ نظر آنے لگتا ہے، اس خشک جھاڑی میں مجھے بھی سانپ نظر آنے لگا۔ یہ ویران علاقہ ایک دورا ہا تھا۔ میں جس راستے پر چل رہا تھا وہ ہموار اور کشادہ تھا اور اس پر دونوں طرف جھاڑیاں تھیں اور میری وہم زدہ آنکھوں کو ہر جھاڑی میں سانپ نظر آ رہے تھے۔ میں نے دوسرے راستے کو دیکھا۔ یہ بالکل اجاڑ اور ناہموار تھا لیکن اس پر جھاڑیاں بہت کم اور چھدری چھدری تھیں۔ میں اسی راستے پر مڑ گیا اور آگے بڑھنے لگا۔

کچھ دور چل کر پھر ایک دورا ہا پڑا۔ ایک راستے پر جھاڑیاں اور ہریالی تھی، دوسرا اجاڑ تھا۔ اسی طرح کئی بار ہوا اور ہر بار میں اجاڑ والے راستوں پر مڑتا رہا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہریالی والے راستے ہی اصل راستے ہیں جو کسی نہ کسی بستی یا بستیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن اجاڑ راستے بھی تو کسی طرف جاتے ہوں گے۔ مارگزیدگی کے بعد سے کبھی کبھی میں عجیب طرح کے وہم میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ مارگزیدوں کے ذہن پر ایسا ہی اثر ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر مجھے یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ویران راستے ہی مجھے میری منزل پر پہنچائیں گے جو معلوم نہیں کہاں ہے، اسی لیے میں ہرے بھرے راستوں سے کتراتا رہا۔

ان راستوں پر ابھی تک مجھے کوئی آدمی نہیں ملا تھا لیکن اب ایک راستے پر مڑنے کے بعد مجھے ایک آدمی اُسی اجاڑ راستے پر جاتا نظر آیا۔ وہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ بہت تھک گیا ہے۔ آخر وہ ایک جگہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے قریب پہنچ کر مجھے بھی تھکن کا احساس ہوا اور میں اسی کے پاس

بیٹھ گیا۔ کندھے پر سے اپنا تھیلا اتار کر زمین پر رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوا: ”کہاں سے آرہے ہو؟“

اس نے ایک قصبے کا نام لیا، میں نے پوچھا، ”وہاں کیا کرتے ہو؟“

”بھیک مانگتا ہوں۔“ اس نے وہی جواب دیا جس کی میں اس کا حلیہ دیکھ کر توقع کر رہا تھا۔

”اور رہتے کہاں ہو؟“

اس نے اپنے سامنے کے اجاڑ راستے کی طرف اشارہ کیا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا، ”دھول بن

میں۔“

”دھول بن میں بھیک نہیں ملتی؟“

”ملتی ہے۔ مگر آندھیوں کی فصل آگئی ہے نا۔ آندھی آتی ہے تو سارے میں دھول جم جاتی ہے،“ اس

نے کہا اور افق پر نظریں جمادیں۔

”آندھی؟“ میں نے کہا۔

”دن بھر چلتی رہتی ہے۔ سب گھروں کے اندر بند رہتے ہیں۔ شام کو آندھی تھمتی ہے تو سب لوگ باہر

نکل کر صفائی ستھرائی کرتے ہیں، پھر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ میں سویرے سویرے گھر سے نکل جاتا

ہوں۔ آندھی تھمنے کے بعد رات کو دھول بن واپس آتا ہوں، لیکن آج یہاں بھکاریوں کی ہڑتال ہے اس

لیے واپس دھول بن جا رہا ہوں۔“

مجھے اس کے مسئلوں سے دل چسپی نہیں تھی کہ دھول بن میں رات میں کون بھیک مانگتا ہے اور کون

بھیک دیتا ہے۔

اس نے اپنی گدڑی سنبھالنا شروع کر دی تھی۔ میں نے پوچھا ”آندھی کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟“

”ٹیالی ہوتی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر افق کی طرف دیکھا، ”آ رہی ہے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چلتے چلتے پوچھا، ”دھول بن میں پردیسیوں کے رہنے کا بھی کوئی ٹھکانا

ہے؟“

”بڑا گھر،“ اس نے کہا۔ ”اگر دھول بن جا رہے ہو تو بس چل دو۔“

”تم چلو، میں آ رہا ہوں۔“

ظاہر ہے اسے نہیں معلوم تھا کہ آندھی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بچپن ہی سے میں آندھی میں گھر کے

اندر نہیں نک پاتا تھا۔ باہر نکل کر پوری آندھی کو اپنے اوپر سے گزرنے دیتا تھا۔ میرے شہر میں رنگین آندھیاں بھی آتی تھیں۔ کالی آندھی، جس سے سب لوگ ڈرتے تھے، مجھے سب سے زیادہ پسند تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل جاتا۔ میرا خیال ہے شروع شروع میں سیاہ آسمان پر ستارے بھی چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ گھروالے مجھے باہر جانے سے روکتے تھے، لیکن میں گھر کے اندر نہیں نک پاتا تھا۔ میں لال اور زرد آندھی میں بھی باہر نکل جاتا اور فضا کو سرخ اور زرد ہوتے دیکھتا تھا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا میں تیز روشنیاں پھیل گئی ہیں۔ صرف زرد آندھی میں مجھے کچھ کچھ ڈر لگتا تھا اس لیے کہ ایک دفعہ میں نے اس آندھی کے ساتھ کچھ انسانی آوازیں بھی سنی تھیں، یا شاید یہ میرا وہم ہو۔

اب میرے علاقے میں نہ کالی آندھی آتی تھی، نہ لال، نہ زرد۔ معمولی آندھیاں کبھی کبھی آتی تھیں اور میں ان میں بھی باہر نکل جاتا تھا۔

میرے ساتھ والا بھکاری مجھے دور جاتا دکھائی دیا۔ اسی وقت مجھے اسی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے دو مٹی کارنگ پھیلتا دکھائی دیا۔

”مٹیالی آندھی“ میں نے سوچا۔ آج تک میں نے مٹیالی آندھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے اسے اپنے اوپر آنے دیا۔ زرا ہی دیر میں میرا پورا بدن گرد سے اٹ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی ٹوکروں میں مٹی بھر کر میرے اوپر پھینک رہا ہے۔ اب ہر طرف مٹی اڑتی دکھائی دے رہی تھی اور روشنی دھندلا گئی تھی۔ اس روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے مجھے کچھ ہی دور پر وہ بستی مل گئی۔ مگر اس سے پہلے کئی بار میرا پیر کسی چھوٹے گڈھے میں آ گیا اور میں گرتے گرتے پچا۔ یہ قدرتی گڈھے نہیں، چھوٹی چھوٹی قبریں سی کھودی گئی تھیں۔

”کیا دھول نگر میں بچوں کی کوئی بیماری پھیلی ہوئی ہے؟“ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اس وقت وہاں سڑک پر کوئی نہیں تھا اور میں اس بستی میں اکیلا گھوم رہا تھا۔

آندھی کا سلسلہ پانچ دن تک رہا اور یہ پانچوں دن میں نے بستی میں تنہا گھومتے ہوئے گزارے۔ روز سویرے گرد اڑاتی ہوئی آندھی شروع ہو جاتی۔ دوپہر سے اس کا زور کم ہونے لگتا۔ شام ہونے سے کچھ پہلے وہ بالکل ختم ہو جاتی اور پوری بستی گرد میں ڈوبی رہ جاتی۔ کچھ دیر بعد گھروں کے دروازے کھلنا شروع ہوتے۔ لوگ بانسوں میں بندھی ہوئی بڑی بڑی جھاڑوئیں لیے ہوئے باہر نکلتے اور گرد کے ڈھیر کناروں پر لگا دیتے، پھر گاڑیاں آتیں اور گرد کے انبار لا کر بستی کے باہر کہیں پھینک آتیں، اور ہوا معلوم نہیں انھیں کہاں

اڑا لے جاتی۔ رات ہونے سے پہلے پوری بستی صاف ہو جاتی اور سڑکوں پر لوگ چلنا پھرنا شروع کر دیتے۔ میں اس وقت تک بستی سے باہر جا چکا ہوتا تھا جہاں ایک بڑے سے درخت کے نیچے میں نے اپنا عارضی ٹھکانا بنالیا تھا۔ وہاں اپنے لباس کو جھٹک جھٹک کر گرد سے صاف کرتا، اپنے بدن اور بالوں سے بھی گرد کو دور کرتا، پھر آدمی بن کر بستی میں داخل ہوتا اور خوائے والوں سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں خرید کر اسی درخت کے نیچے آ جاتا۔ دوسرے دن سویرے سے آندھی کی سنسنی شروع ہو جاتی۔ گھروں کے دروازے بند ہونے لگتے اور پوری بستی میرے اختیار میں ہو جاتی۔

فضا میں پھیلی ہوئی دھند کے باوجود ان سیروں میں قریب قریب پوری بستی میری نظر سے گزر گئی۔ اس کے زیادہ تر مکان بہت پرانے بنے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بستی کا رقبہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس کے رہنے والوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا اس لیے کہ ابھی تک میری ملاقات اس پہلے دن والے بھکاری اور دو تین دکان داروں سے ہوئی تھی۔ باقی بستی میرے لیے اجنبی تھی جس طرح میں اس کے لیے اجنبی تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ لوگ دھول کے دنوں میں اپنے مکان کی کھڑکیوں سے محض وقت گزاری کے طور پر سڑک کو دیکھتے رہتے تھے۔ وہ مجھ کو اس حد تک جانتے تھے کہ کسی دوسری جگہ کا آدمی آندھی میں باہر چلتا پھرتا ہے اور رات بستی سے باہر والے درخت کے نیچے گزارتا ہے۔

رفتہ رفتہ وہاں والوں سے میری جان پہچان شروع ہوئی۔ میرا پہلا شناسا وہی بستی کا بھکاری تھا۔ اس سے میری اکثر بات چیت ہوتی تھی، اور اسی سے میں نے بستی کے باہر والے درخت کا ذکر سنا۔ اس نے مجھے بستی کے باہر خصوصاً اس درخت کے نیچے ٹھہرنے سے منع کیا اور بتایا کہ وہ درخت منحوس ہے۔ اس نے بغیر نام لیے ایک شخص کا ذکر کیا جو اس درخت سے گر کر مائوف ہو گیا تھا۔ میں نے اس شخص کا نام پوچھا تو وہ آہ بھر کر بولا، ”تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“

اور ایک بار پھر مجھ سے بستی کے بڑے مکان میں رہنے کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں غریب لوگ مفت رہتے ہیں۔ میں غریب نہیں تھا، اس لیے میں نے اسی درخت کے نیچے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک رات مجھے اس درخت سے ڈر لگنے لگا، اس کی بل کھائی ہوئی شاخوں پر سانپوں کا گمان ہو گیا۔ اس رات میں نے خواب میں دیکھا کہ اس پر سے دو سانپ گرے اور میرے قریب سے ریگلتے ہوئے کہیں غائب ہو گئے۔ خوابوں کا اب مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا، لیکن سانپ میں نے پہلی مرتبہ خواب میں دیکھے تھے۔ میں نے ڈرتے

ڈرتے اپنے آس پاس تلاش بھی کیا۔ ظاہر ہے مجھے کوئی سانپ نظر نہیں آیا مگر ہر مارگزیدہ کی طرح یہ خیال میرے وہم آلود ذہن میں بیٹھ گیا کہ اس درخت پر ضرور سانپ رہتے ہیں اور میں ان کی زد میں ہوں۔ دوسرے دن میں نے اپنا بستہ درخت کے نیچے سے ہٹا لیا اور کسی دوسری بستی کے بارے میں وہاں کے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ سب سے پہلے پرانے ملاقاتی بھکاری کو تلاش کیا۔ وہ جس جگہ پر بھیک مانگتا تھا وہاں نہیں ملا تو بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ بیمار ہے اور دو تین دن سے بڑے مکان میں پڑا ہے۔ بڑے مکان کا پتا ہر ایک کو معلوم تھا۔ میں وہاں پہنچا۔ بڑے رقبے کی اچھی پختہ عمارت تھی۔ چھوٹے چھوٹے کمرے بہت تھے۔ ایک کمرے میں وہ گودڑ لیٹے پڑا ہوا تھا۔ بڑے مکان کے صاف ستھرے کمرے میں وہ بے جوڑ معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا گودڑ سنبھال کے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ میں نے بھی اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور وہ اپنے گودڑ پر قریب قریب گر گیا۔ میں نے اس سے دوا علاج کو پوچھا تو بولا:

”ڈاکٹر صاحب تیسرے دن پر آتے ہیں۔ کل آئیں گے۔“

اس کے بعد اس نے اپنی بیماری کی غیر دل چسپ تفصیل بیان کرنا شروع کر دی۔ معمولی بخار تھا، دو تین دن میں خود ہی اتر جاتا لیکن وہ اسے کوئی بڑی بیماری سمجھ رہا تھا۔ تب اسے میری مزاج پر سی کا خیال آیا، میں نے بتایا کہ اب میں درخت کے نیچے نہیں رہوں گا۔ خیراتی مکان میں بھی نہیں رہوں گا۔ پھر پوچھا، ”جس بستی میں تم آندھی کے دنوں میں جاتے ہو وہاں رہنے کا ٹھکانا مل سکتا ہے؟“

”وہاں بھیک بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بے مروت لوگ ہیں۔ میں تو پیٹ کی خاطر وہاں جاتا ہوں۔“

اس نے کہا اور پھر کہا، ”آخر اس بڑے مکان میں کیا برائی ہے؟“

کوئی برائی نہیں تھی لیکن میں وہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی مناسب جواب سوچ رہا تھا کہ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ فقیر نے پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ”ڈاکٹر صاحب آج ہی آ گئے!“

اتنے میں ایک ڈاکٹر اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ ساتھ والے نے کہا،

”کہوسر دار، اتنے دن سے بیمار پڑے ہو اور ہم کو اطلاع نہیں کی۔“

فقیر نے جواب دیا، ”حضور، کل ڈاکٹر صاحب کے آنے کا دن...“

”تمہیں معلوم نہیں کہ جب یہاں کوئی بیمار پڑتا ہے تو ڈاکٹر صاحب اپنی باری چھوڑ کر بھی آ جاتے ہیں۔“ اس نے ڈاکٹر کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کر کے اپنے بیگ سے دو تین گولیاں نکالیں اور ان کے استعمال کی ترکیب بتا کر اٹھنے کو ہوا۔ لیکن ساتھ والا بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے ڈاکٹر کو کچھ اشارہ کیا اور ڈاکٹر اسے سلام کر کے چلا گیا۔ آدمی نے فقیر سے کہا، ”بھئی سردار، سنا ہے بستی میں کوئی باہر کا آدمی آتا ہے۔“

”باہر کے آدمی تو مختار صاحب بستی میں آتے ہی رہتے ہیں۔“

”نہیں، جو آندھی کے وقت بستی میں گھومتا ہے۔“

تب میں نے اس آدمی کو زرا غور سے دیکھا جس کو فقیر مختار صاحب کہہ رہا تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور لباس سے کوئی خاص آدمی معلوم ہوتا تھا۔ فقیر نے میری طرف اشارہ کیا اور بولا، ”یہی ہیں۔“

اب مختار کو شاید پہلی مرتبہ میری موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے بہت قاعدے سے جواب دیا، اور فقیر نے مجھے بتایا، ”مختار صاحب یہاں کی جائداد دیکھتے ہیں۔“

”آپ بڑے مکان ہی میں رہتے ہیں؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”جی نہیں۔ بستی کے باہر رہتا ہوں اور اب کسی اور بستی میں جانے کو سوچ رہا ہوں۔“

”کیوں؟ بڑا مکان پسند نہیں آیا؟ یہ آپ ہی لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے۔“

”یہ غریبوں اور محتاجوں کے لیے ہے۔ میرا اس پر حق نہیں ہے۔“

”کیوں؟ آپ یہاں کی آندھی سے گھبرا گئے؟“

”آندھی سے میں نہیں گھبراتا۔ جب تک میرے شہر میں آندھیاں آتی تھیں، میں ہر آندھی کو باہر نکل

کر اپنے سینے پر لیتا تھا۔ مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔“

”عجیب!“ اس نے مجھے دل چسپی سے دیکھا۔ ”آپ کے یہاں آندھی کے ساتھ گرد نہیں آتی تھی؟“

”شاید نہیں آتی تھی۔ میں نے غور نہیں کیا۔ کم سے کم یہاں کی مٹیالی آندھی کے مقابلے میں۔“

آپ نے آندھی کو تماشے کی طرح دیکھا ہے،“ اس نے لمبی سانس لی، ”ہم کو اس سے لڑنا پڑتا ہے۔“

”پھر آپ لوگوں نے اس بستی کو رہنے کے لیے کیوں پسند کیا؟“

”لمبا قصہ ہے۔ کم سے کم گرد ہٹانے کے بہانے پوری بستی کی صفائی ہوتی رہتی ہے۔“

میں نے غور کیا۔ واقعی اس بستی سے زیادہ صاف ستھری بستی میں نے نہیں دیکھی تھی۔
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک سردار کو دیکھتا رہا۔ پھر برابر اسامندھ بنا کر بولا، ”بھئی سردار، تمہارے پاس
قاعدے کے کپڑے نہیں ہیں؟ یہ کیا گودڑ لپیٹے پڑے ہو؟“
”اچھے کپڑے ہیں، مختار صاحب۔ تہوار اور شادی بیاہ میں پہنتا ہوں۔ گودڑ نہ لپیٹوں تو کوئی بھیک بھی
نہ دے گا۔“

”سچ کہتے ہو،“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ رقم نکال کر سردار کے سرہانے رکھ دی۔ پھر مجھ
سے بولا، ”اچھا آج ہماری خاطر بڑے مکان میں رہ لیجیے۔ پھر کل سے کچھ اور انتظام کر لیجیے گا۔ دوسری بستی
میں پہنچتے پہنچتے آپ کو رات ہو جائے گی۔ یہاں رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں، راستے میں گڈھے بہت پڑتے
ہیں،“ اس نے مسکرا کر سردار کو دیکھا، ”برابر والا کمر خالی ہے۔ اس میں آرام کیجیے۔ سردار آپ کا دل
بھلائے گا۔ دل چسپ آدمی ہے مگر باتیں بہت کرتا ہے۔“
سردار ہنسنے لگا، ”آپ بھی مختار صاحب...“
لیکن وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر جا چکا تھا۔

سردار واقعی دل چسپ آدمی تھا اور واقعی بہت باتیں کرتا تھا۔ اس رات ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور
اس سے مجھ کو دھول بن کے بارے میں اتنا معلوم ہو گیا جتنا شاید کئی مہینے میں معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔
دھول بن، اس نے بتایا، کوئی بستی نہیں تھی۔ بس اونچی نیچی بنجر زمین کے چھوٹے بڑے قطعے تھے جن پر
لمبی گھنی جھاڑیاں اور کچھ درخت تھے، جن کو پانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بڑے مالک نے وہ ساری زمین
خرید لی اور اس پر مکان وغیرہ بنوائے۔ کنارے پر کئی نشیبی زمین کو گہرا کھدوا کر وہاں ایک بڑا تالاب
بنوایا۔ پانی زمین پر بہت نیچے تھا جس کے لیے کئی گہرے کنویں کھدوائے۔ بیچ میں آندھیاں آتی رہیں لیکن
بڑے مالک نے ان کی پروا نہیں کی اور آندھی کی لائی ہوئی دھول کو ہٹاتے رہے۔
”لیکن انھوں نے اس بستی کو... دھول بن کو کیوں پسند کیا؟“

”بس اپنی بستی بسانے کا شوق۔ میں نے بتایا نہیں کہ یہ کوئی بستی نہیں تھی، کوئی اس زمین کا مالک نہیں
تھا۔ صرف کچھ بنجارے سال دو سال میں یہاں ڈیرے لگاتے تھے۔ بڑے مالک نے سرکار سے ساری
زمین خرید لی۔ بنجاروں کے لیے پچھم کی طرف کچھ زمین الگ کر دی، اور یہاں مکان وکان بنانے میں لگ

گئے۔ لیکن بڑے مالک کا بلاوا آ گیا۔“

اس نے لمبی سانس لی اور موت کے بارے میں ایک فلسفیانہ سی تقریر شروع کر دی۔ اس کی آواز سنتے سنتے میں سو گیا۔

درخت کے نیچے کی بے آرام زندگی کے بعد بڑے مکان کے اس کمرے میں ایسی اچھی نیند آئی کہ سویرے بہت دیر میں آنکھ کھلی۔ آندھی شروع ہو گئی تھی اور بستی کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ درخت کے نیچے دیر میں جاگتا تھا تو بھی آندھی میں باہر نکل سکتا تھا، یہاں میں بڑے مکان میں بند ہو گیا تھا۔ مجھے گھٹن محسوس ہو رہی تھی لیکن بستر پر پڑا سوتا جاگتا رہا۔ اپنے ٹھکانے پر جانے کا خیال نہیں آیا۔ شام کو بازار کا ایک چکر لگایا۔ دکان دار مجھ کو پہچاننے لگا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ بھی مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں آندھی میں باہر کیوں گھومتا ہوں۔ میں نے اسے بھی یہی جواب دیا کہ باہر نکلتا مجھے اچھا لگتا ہے۔ وہ بولا، ”مختار صاحب بھی پوچھ رہے تھے۔ ان سے چھوٹی مالکن نے پوچھا ہوگا۔“

دھول بن کی چھوٹی مالکن کا ذکر اس دن میں نے پہلی بار سنا۔ سوچا اس سے کچھ اور معلوم کروں۔ پھر چپ رہنا بہتر معلوم ہوا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب سردار کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور وہ اپنے گودڑ میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ وہ ٹھیک سے جواب بھی نہ دے سکا۔ اسے سردی بہت لگ رہی تھی۔ پھر بھی میں اس کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا۔ طبیعت آپ ہی آپ الجھ رہی تھی۔ اپنے ٹھکانے پر جانے کی تیاری کرتے کرتے معلوم نہیں کب سو گیا۔ دوسرے دن پھر دیر میں اٹھا اور پھر دن بھر بڑے مکان میں بند پڑا رہا۔

شام کو ڈاکٹر پھر سردار کو دیکھنے آیا۔ مختار صاحب اس کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی وہ بیٹھے رہے۔ دو تین بار انھوں نے بھی سردار کی نبض دیکھی۔ پھر مجھ سے پوچھا، ”کہیے، آپ نے کیا طے کیا؟“ میں نے کچھ طے نہیں کیا تھا لیکن اب بڑے مکان میں مجھ کو نہیں رہنا تھا۔ اس لیے میں نے یوں ہی کہہ دیا، ”کل چلا جاؤں گا۔ آج شاید اپنے پرانے ٹھکانے پر سو جاؤں۔ کل دن میں کوئی اور بستی دیکھوں گا۔“

”دن میں؟“ انھوں نے پوچھا، ”اور آندھی؟“

”آندھی میں باہر نکلنے کا عادی ہوں،“ میں نے کہا اور یہ سوچ کر شرمندہ ہوا کہ آج کا دن میں نے ضائع کر دیا۔ درخت کے نیچے رہتا تو کوئی اور بستی ڈھونڈ لیتا۔ مختار صاحب کو شاید میرے خیال کا اندازہ

ہو گیا۔ انھوں نے کہا، ”آندھی میں دن کو کوئی کام نہیں ہو سکتا،“ انھوں نے پہلے دن کی کبھی ہوئی بات دہرائی، ”آپ نے آندھیوں کو تماشے کی طرح دیکھا ہے۔“

”میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ اس وقت تماشا بھی ضروری کام معلوم ہوتا تھا۔“

میں نے سوچا میں خواہ مخواہ بحث میں الجھ رہا ہوں۔ بات بدلنے کے لیے کچھ اور سوچ رہا تھا، لیکن اچانک مختار صاحب نے کہا، ”ہمیں رنگین آندھیوں کے بارے میں بتائیے۔“ میں نے سرسری طور پر بتا دیا۔ مختار صاحب سنتے رہے، پھر بولے، ”واقعی تماشا معلوم ہوتا ہوگا۔ خاص کر بچوں کو۔“

”بچے کبھی کبھی ڈر بھی جاتے تھے۔ مجھے ڈر نہیں لگتا تھا اس لیے گھر سے باہر نکل جاتا تھا۔“

”عجیب!“ مختار صاحب نے وہی کہا جو پہلے دن کہا تھا، اور پھر کہا، ”عجیب!“

تھوڑی دیر بیٹھ کر مختار صاحب رخصت ہو گئے۔ میں ان کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر سردار کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کو نیند آرہی تھی۔ میں نے اس سے بات نہیں کی اور اپنے کمرے میں آیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور باہر نکلا تو کچھ دور پر مختار صاحب نظر آئے۔ ان کے ساتھ کوئی خوش لباس عورت اور کچھ مزدور قسم کے آدمی تھے۔ میں ان سب کی نظر بچا کر آگے بڑھا۔ تھوڑی دور جا کر رک گیا اور اپنے ٹھکانے والے درخت کے نیچے جانے کی ہمت باندھنے لگا۔ اس میں کچھ دیر لگی۔ پھر آگے بڑھنے لگا۔ مگر اپنی پشت پر مختار صاحب کی آواز سن کر رک گیا۔ وہ قریب ہی کھڑے کہہ رہے تھے، ”صاحب کہاں چلے؟“

”آپ کو شاید بتا چکا ہوں۔“

”لیکن رات کو سفر کرنا...“

اسی وقت ایک مزدور نے قریب آ کر کہا، ”مختار صاحب، چھوٹی مالکن نے آپ کو بلایا ہے۔ کہا ہے اُن کو بھی لیتے آئیے گا۔“

”ان کو کن کو؟“

”وہی جو آندھی میں باہر گھومتے ہیں،“ مزدور نے کہا، پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی، ”یہی تو ہیں۔“

”اچھا، تم چلو،“ مختار صاحب نے کہا، پھر مجھ سے بولے، ”چلیے صاحب، ملکیہ یاد کر رہی ہیں...“

”ملکیہ کون؟“

”دھول بن کی مالک وہی ہیں۔ کبھی کبھی باہر سے آنے والوں کو اپنے یہاں بلاتی ہیں۔“

”لیکن مجھے کیوں؟“

”شاید آندھی کے دنوں میں آپ کے باہر نکلنے کی وجہ سے۔“

”لیکن آندھی میں باہر نکلنا کوئی نرالی بات نہیں ہے۔“

”نہیں ہے۔ لیکن جب میں نے انھیں بتایا کہ آپ آندھی کے وقت مکان کے اندر نہیں رہ سکتے ...

ان کا خیال ہے کہ وہ آپ کو جانتی ہیں۔ کم سے کم ان کی والدہ جانتی تھیں، اور شاید ان کے میاں بھی۔“

”ان کے میاں کیا اب نہیں ہیں؟“

”ہیں، لیکن بے ہوش رہتے ہیں۔“

”کیوں؟“

”آپ والے درخت سے گر گئے تھے۔ سر کے بل گرے تھے۔ اس کے بعد سے ...“

”تو سردار انھیں کا ذکر کر رہا تھا،“ میں نے سوچا۔ ”لیکن وہ اس درخت پر چڑھے ہی کیوں تھے؟“

اس عرصے میں بھول گیا کہ میں نے ان سے کچھ پوچھا تھا۔ شاید دوا علاج کے بارے میں کوئی رسمی سوال تھا۔

مختار صاحب کہہ رہے تھے:

”شہر کے ہسپتالوں میں دکھایا گیا، دو جگہ بھرتی بھی رہے۔ عاملوں، جھاڑ پھونک والوں، بنجاروں سے

بھی مدد لی گئی، سب بے کار! اب ہر وقت بے ہوش رہتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر رکھ لیا گیا ہے۔ کبھی کبھی کچھ دیر کو

ہوش آتا بھی ہے تو ہوش کی باتیں نہیں کرتے۔ ایک تو ان کے منہ سے بات نکلتی ہی نہیں، پھر آواز ...“ اچانک

وہ رک گئے، پھر بولے، ”لیجیے ان کا مکان آ گیا۔“

میں نے اپنے بائیں ہاتھ پر بنی ہوئی کوٹھی کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

ایسا معلوم ہوا کہ میں اپنے لڑکپن کے مکان کو دیکھ رہا ہوں جو کبھی کا ختم ہو چکا تھا اور میں اُسے بھلانے

میں بڑی مدت کے بعد کامیاب ہوا تھا۔ اس مکان کی روکار، برآمدے کے در اور اندر ڈیوڑھی بالکل اُسی

مکان کی سی تھی۔

مختار صاحب اندر چلے گئے تھے اور میں اپنے اس مکان کی ایک ایک چیز کو یاد کر رہا تھا۔ اس کے رہنے

والے، میرے بزرگ، ان کی صورتیں بلکہ آوازیں تک مجھے یاد آنے لگیں۔ اپنے یہاں کے ملازم، مہمان

اور آئے دن کے ہنگامے، وہ لوگ جن میں سے اب کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے ان سب کو بھلا دیا تھا، لیکن

یہ میری بھول تھی۔ بچپن کی دوسری یادوں کی طرح یہ یادیں بھی میرے دماغ میں کہیں موجود تھیں اور اب

ایک ایک کر کے یا ایک ساتھ تازہ ہو رہی تھیں۔

یہ سب شاید چند لمحوں کے اندر ہو گیا۔ مختار صاحب کو گئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی اور اب وہ واپس آ کر مجھ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”آئیے، بلا رہی ہیں،“ انھوں نے کہا اور میں ان کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہو گیا۔

مکان کا یہ مردانہ حصہ تھا اور میرے مکان کے مردانے سے خاصا مختلف تھا۔ زنانے حصے کو ایک دروازہ باقی مکان سے الگ کرتا تھا۔ اُدھر سے عورتوں کی آوازیں آرہی تھیں اور ایک بچہ یکساں آواز میں رورہا تھا۔ مختار صاحب نے اس دروازے پر دستک دی اور بلند آواز سے کہا، ”بتا دو، وہ آگئے ہیں۔“
 میں نے اتنی دیر میں مردانے حصے کو دیکھ لیا تھا۔ ایک بڑا کمر تھا اور اس سے متصل دو چھوٹے کمرے۔ بڑے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ چھوٹے کمروں میں معمولی دفتری سامان بے ترتیبی سے ڈھیر تھا۔ کتابیں بھی بہت سی تھیں، زیادہ تر درختوں کے بارے میں۔ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مختار صاحب نے مجھے انہی میں سے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

کچھ دیر بعد ملکہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اسے کوئی پختہ عمر کی عورت سمجھ رہا تھا لیکن وہ جوان اور مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی تھی، میں سمجھ رہا تھا کہ اس سے بات کرنے میں مجھے کچھ تکلف ہوگا، لیکن عمروں کے فرق نے اس تکلف کو باقی نہیں رہنے دیا۔ پھر بھی کچھ دیر تک میں اس سے بہت سنبھل کر گفتگو کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے کچھ رسمی سوال پوچھے۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ یہاں کا راستہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا، وغیرہ۔ میں نے سرسری طور پر سردار سے ملاقات کا حال بتا دیا پھر خاموش ہو گیا۔ ملکہ نے مختار صاحب سے پوچھا:

”آپ نے انھیں سب بتا دیا ہے؟“

”سب نہیں۔ یہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔“

”اب بات کر لیجیے،“ ملکہ نے کہا، پھر اٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا، ”آپ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں؟“

”میں جس طرح کی زندگی گزار رہا ہوں،“ میں نے جواب دیا، ”اس میں پسندنا پسند کا سوال نہیں ہوتا۔ جو بھی جہاں بھی مل جائے،“ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”اور اس وقت کھانا کھا

چکا ہوں۔ آپ میرے لیے تکلیف نہ کیجیے۔“

ملیکہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے وہ سوال کیا جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔ ”آپ کا مکان بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بنایا ہے؟“

”یہ ہماری امی نے بنوایا ہے۔ شادی سے پہلے وہ جس مکان میں جایا کرتی تھیں وہ انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں دھول بن میں جب ہمارے ابو ان کے لیے مکان بنوا رہے تھے تو امی نے ان سے ویسا ہی مکان بنوانے کی فرمائش کی اور اس کا نقشہ جیسا ان کو یاد تھا انھیں بنا کر دکھایا۔“

اچانک وہ مجھے یاد آ گئیں اور میں نے ملیکہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا، ”معاف کیجیے۔ آپ کی والدہ کا نام زینت بیگم تو نہیں تھا؟“

”آپ کو کیوں کر معلوم ہوا؟“

”وہ اکثر ہمارے یہاں آ کر مہمان رہا کرتی تھیں۔“

ملیکہ نے مختار صاحب کی طرف دیکھا اور وہ بولے، ”عجیب! عجیب!“

ملیکہ نے مجھ سے پوچھا، ”یہ کب کی بات ہے؟“

”زمانے کا ٹھیک خیال نہیں، لیکن اس وقت میں لڑکا سا تھا۔“

”تو وہ آپ کو یاد کیوں کر رہ گئیں؟“

”وہ میرا آندھی میں گھومنا بڑے شوق سے دیکھتی تھیں۔ باقی گھر کے لوگ تو مجھے روکتے تھے، ڈراتے بھی تھے۔ لیکن میں آندھی کے آثار نظر آتے ہی دوڑ کر ان کو بتا دیتا تھا اور وہ کسی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اس وقت ہمارے شہر میں رنگین آندھیاں آیا کرتی تھیں۔ انھیں بھی شاید یہ آندھیاں اچھی لگتی تھیں۔“

زینت بیگم بہت خاموش طبع اور اپنی بیٹی ہی کی طرح نازک اندام تھیں۔ وہ میری والدہ کو کسی سفر میں ریل پر ملتی تھیں۔ میری والدہ میں کچھ ایسی بات تھی کہ خاندان بھر کے لوگ اور باہر والے بھی اپنے دکھ درد ان کے سامنے کھل کر بیان کر دیتے تھے اور ان کی غم خواری سے تسلی پا جاتے تھے۔ زینت بیگم کی زندگی میں بھی کچھ پریشانیاں تھیں۔ وہ جب ہمارے یہاں آتیں تو دیر دیر تک ہماری اماں سے اکیلے میں باتیں کرتی اور کبھی کبھی روتی تھیں۔ اماں ان کو سمجھاتی بچھاتی تھیں اور وہ مطمئن ہو کر واپس جاتی تھیں۔ پھر کچھ دن تک ان کے خط آتے رہتے تھے جن میں وہ مجھ کو ضرور پوچھتی تھیں اور رنگین آندھیوں سے میری دل چسپی کا بھی ذکر

کرتی تھیں۔

مجھے وہ دن ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے اور میں اُن میں گم ہو کر بھول چلا تھا کہ اس وقت کہاں بیٹھا ہوں۔ اتنے میں ملکہ نے مجھ سے پوچھا، ”وہ آپ کے یہاں کب تک آتی رہیں؟“

”میرا لڑکپن ہی تھا۔“

”یہ سب میرے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں ہیں،“ ملکہ نے اپنے آپ سے کہا، پھر اٹھتے اٹھتے مختار صاحب سے بولی، ”یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔ آپ انہیں سب بتا دیجیے۔“ اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

مختار صاحب کچھ دیر چپ بیٹھے رہے، پھر کہنے لگے، ”مجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں اور کیا کیا بتاؤں۔“

”آپ کو جو کچھ یاد آتا جائے بے تکلف بتائیے،“ میں نے کہا، ”ضرورت ہوگی تو بیچ میں کچھ پوچھ لوں گا۔“ اور مختار صاحب نے بتانا شروع کیا:

”زینت بیگم میری بڑی بہن تھیں۔ ان کی شادی کم عمری میں ہو گئی تھی۔ میاں رئیس زادہ اور طوائفوں کا شوقین تھا۔ بیوی سے زیادہ مطلب نہیں رکھتا تھا۔ دو سال تک زینت بیگم اس کی وجہ سے بہت پریشان رہیں۔ اس کی اصلاح کی کوشش کی مگر وہ نہیں سدھرا اور آخر ایک طوائف کے کوٹھے ہی پر مر گیا۔ پھر بھی اس کے پاس کافی دولت بچ گئی تھی۔ اس لیے زینت بیگم کو پیسے کی تنگی نہیں ہوئی۔ بس تنہائی سے گھبراتی تھیں اور کبھی کبھی کسی دوسرے شہر میں نکل جاتی تھیں۔ اسی زمانے میں ریل کے ایک سفر میں آپ کی والدہ سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ زینت بیگم کو بہت پسند کرتی تھیں اور اکثر انہیں اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ میں اُس زمانے میں بے روزگار تھا۔ عمر بھی کم تھی۔ زینت بیگم مجھے اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ آپ کی والدہ ان سے دوسری شادی کے لیے اصرار کیا کرتی تھیں۔ آخر وہ راضی ہو گئیں۔ آپ کی والدہ نے ان کے لیے بہت سوچ سمجھ کر بڑے صاحب کا انتخاب کیا۔ ان کی بھی ایک شادی ہو چکی تھی۔ عمر بھی کچھ زیادہ تھی لیکن آپ کی والدہ کو یقین تھا کہ وہ زینت بیگم کی بڑی قدر کریں گے اور واقعی...“

”آگے بتائیے۔“

”وہ بہت قابل آدمی تھے۔ ان کو معلوم نہیں کیا کیا آتا تھا۔ دولت مند بھی تھے۔ شہر میں ان کی کئی بڑی کوٹھیاں اور دوسری جائیداد تھی۔ لیکن آپ کی والدہ ان کی شادی میں شریک نہیں ہو سکیں۔ اس سے کچھ دن پہلے ہی آپ کے مکان کا واقعہ...“

”مجھے معلوم ہے،“ میں نے ان کی بات کاٹ دی، ”آپ آگے سنائیے۔“

”میں نے کہا کہ بڑے صاحب کو معلوم نہیں کیا کیا آتا تھا، لیکن ان کی اصل دل چسپی تعمیری کاموں اور درختوں میں تھی۔ اسی لیے انھوں نے دھول بن کی یہ اجازت زمین خریدی اور اس کے لیے معلوم نہیں کہاں کہاں سے درختوں کے گیلے لاکر رکھے، اور یہاں کئی مکان بنوائے جن میں غریبوں کے لیے بڑا مکان سب سے شان دار تھا۔ اس کے علاوہ...“ وہ پھر رکے، پھر بولے، ”ان کے چھوٹے بھائی باپ کی زندگی ہی میں مر گئے تھے اور پھر ماں بھی ختم ہو گئیں اور انھوں نے اپنے یتیم بھتیجے کو پالا تھا، میرا مطلب ہے چھوٹے صاحب کو، اور زینت بیگم سے شادی کے وقت انھوں نے ان سے اجازت لے لی تھی کہ چھوٹے صاحب کو اپنے ساتھ رکھیں گے۔ اس وقت چھوٹے صاحب قریب بارہ برس کے تھے اور شہر کے کسی اسکول میں پڑھتے تھے۔ زینت بیگم کے یہاں بھی شادی کے دوسرے سال ملکہ پیدا ہوئی اور چھ سال کی ہوگی کہ وہ بھی شہر کے اسکول میں داخل کر دی گئی۔ لیکن زینت بیگم اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکیں، اس لیے بڑے صاحب نے دوسرے ہی سال اسے اسکول سے اٹھالیا اور یہیں دھول بن میں اسے اپنی نگرانی میں تین ماسٹروں سے پڑھواتے رہے۔ وہ چھوٹے صاحب سے بہت مانوس ہو گئی تھی اس لیے بڑے صاحب نے ان کی پڑھائی کا انتظام بھی دھول بن ہی میں کیا۔“

”آگے سنائیے،“ میں نے پھر انھیں ٹوک دیا۔ کسی کی بات سننے کا یہ مہذب طریقہ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت مجھ کو یہ ساری تفصیل غیر دل چسپ معلوم ہو رہی تھی۔ مختار صاحب کو بھی شاید میری اکتاہٹ کا اندازہ ہو گیا اور وہ رک کر کچھ سوچنے لگے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ میں نے کہا، ”آپ اپنا حال بتائیے۔“ اور انھوں نے زرا دل چسپی کے ساتھ بتانا شروع کیا:

”زینت بیگم نے بھی ان کے ساتھ شادی کی ایک شرط رکھی تھی کہ وہ اپنے بھائی کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گی۔ بڑے صاحب کو ان کی ہر شرط منظور تھی۔ اس طرح میں بھی یہاں آ گیا اور بڑے صاحب مجھے بھی اُسی طرح چاہنے لگے جس طرح اپنے بھتیجے کو چاہتے تھے۔ ایک دن بولے، ’بھئی مختار، تمہارا تو نام ہی مختار ہے۔ ہم تمہیں دھول بن کی جائداد کا مختار بناتے ہیں۔‘“

”دل چسپ آدمی تھے بڑے صاحب،“ میں نے کہا۔

”لاجواب آدمی تھے۔ دھول بن کو بسانے کے لیے انھوں نے شہر سے آدمی چھانٹ چھانٹ کر ان کو مکان مہیا کر دیے۔ جن کی اتنی حیثیت بھی نہیں تھی ان کے لیے بڑا مکان تھا۔ پہلی ہی کھیپ میں وہ سردار کو بھی

پکڑ لائے۔ کہتے تھے ہر ہستی میں ایک آدھ فقیر ہونا ضروری ہے۔“

”مجھے تو زیادہ تر لوگ بہت غریب نظر آئے۔“

”اس لیے کہ وہ واقعی غریب ہیں۔ اکثر ان میں سے کاری گر اور مستری قسم کے لوگ ہیں جن کا کام شہر میں نہیں چلتا تھا۔ سردار بھی ایک درگاہ کے سامنے بیٹھا کھیاں مارا کرتا تھا۔ یہاں اس کا بھی کام چل نکلا۔ وہ دھول بن کا سب سے پرانا باشندہ ہے۔ اور دھول بن کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔“

”بڑے صاحب اس سے بے تکلف تھے؟“

”وہ ہر ایک سے بے تکلف ہو جایا کرتے تھے۔ اور ہنسی کی بات پر اتنا زبردست ہتھ پہ لگاتے تھے کہ درختوں پر سے چڑیاں اڑ جاتی تھیں۔“

درختوں کے ذکر پر مجھے یاد آیا:

”مختار صاحب، دھول بن کے آس پاس کوئی درخت...“

’بہت تھے۔ سب کٹوا دیے بڑے صاحب نے، بس وہ آپ والا درخت ناپ کے لیے چھڑوا دیا۔“ وہ کچھ اور بتانے جا رہے تھے لیکن رک گئے اور مجھے سلام کر کے چلے گئے۔

اس رات میں نے اپنے درخت کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی خاص بات تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور میں درخت کو دیکھتے ہوئے سو گیا۔ سویرے اٹھ کر میں نے پھر اس کو غور سے دیکھا۔ اس کی شاخیں بہت گھنی اور بے ترتیب سی تھیں لیکن اس کی ہر شاخ چار میں سے کسی ایک سمت اشارہ کرتی تھی۔ بے سمت شاخ اس درخت میں کوئی نہیں تھی۔ اب مجھ کو وہ درخت بہت انوکھا اور ہزاروں درختوں میں سب سے الگ معلوم ہونے لگا۔ کم سے کم مجھے یہی یقین تھا کہ میں اسے ہزاروں درختوں کے بیچ میں پہچان لوں گا۔

دوسرے تیسرے دن آندھی ختم ہو گئی اور دھول بن میں دن کا کاروبار شروع ہو گیا۔ ایک دن سردار بھی ملا اور میں نے قریب قریب سارا دن اس سے باتیں کرنے میں گزار دیا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ بخاروں کی ٹولی واپس اپنے پڑاؤ پر آگئی ہے۔ اس نے بخاروں کے چودھری کا نام بھی لیا۔ ”چودھری بلم بوڑھا ہو گیا ہے مگر ابھی ٹانٹھا ہے۔“

بلم؟ کیا ماضی کے سارے بھوت یہیں دھول بن میں جمع ہو رہے ہیں؟ میں نے بد مزگی کے ساتھ سوچا۔ جب میں شروع میں گھر سے نکلا تھا تو کچھ دن بلم کی ٹولی میں بھی رہا تھا۔ اچھے لوگ تھے۔ سردار کے پاس سے اٹھ کر میں بخاروں کے پڑاؤ پر پہنچا۔ چودھری بلم نے فوراً مجھے پہچان لیا۔

رات بہت دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ زیادہ تر اس کی گردنوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اس نے بتایا کہ بڑے صاحب کے لیے بہت سے درخت اسی کی ٹولی نے ڈھونڈ کر نکالے تھے۔

”چودھری، یہ بتاؤ،“ میں نے پوچھا، ”وہ درخت جو چھوڑ دیا گیا ہے۔“

”ہمیں اس کا نام نہیں معلوم۔ بڑے صاحب کہیں سے لائے تھے۔ یا شاید وہ پہلے سے لگا ہوا تھا۔ بڑے صاحب اس کی ایک ٹہنی بھی کسی کو توڑنے نہیں دیتے تھے۔“

رات زیادہ آگئی تھی۔ میں پڑاؤ میں پرسو گیا۔ سویرے مختار صاحب کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو وہ بلم سے پوچھ رہے تھے کہ اس سے میری جان پہچان کس طرح ہوئی۔ مجھے جاگتے دیکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہم آپ کو درخت کے نیچے ڈھونڈ رہے تھے۔ آج آپ کو ملکہ سے ملنا ہے۔“

”کس وقت؟“

”تھوڑی ہی دیر میں مل لیجیے تو اچھا ہے۔ ملکہ آپ کو اپنی کہانی سنائیں گی جس طرح زینت بیگم آپ کی والدہ کو سناتی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ آپ سے باتیں کر کے ان کا دل ہلکا ہو جائے گا۔“

تھوڑی دیر بعد میں ملکہ سے ملا۔ آج وہ بہت اچھا لباس پہنے تھی۔ اور سوگواری کا انداز جو اس پر طاری رہتا تھا، آج نہیں تھا۔ معمولی گفتگو کے بعد اس نے بتانا شروع کیا:

”ابو امی کے دیوانے تھے۔ امی نے آندھیوں کی شکایت کی تو وہ آندھیاں روکنے کی تدبیروں میں لگ گئے۔ معلوم نہیں کون کون سے درخت جمع کر کے گملوں میں لگا لیے اور ان کی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔ گملوں کے پودے کئی برس پرانے تھے۔ ابو نے بتایا کہ جب یہ گملوں سے زمین میں لگائے جائیں گے تو ایک دو برس میں چھتنار درخت ہو جائیں گے۔ ایک دن وہ اور چھوٹے صاحب بہت خوش خوش امی کے پاس آئے۔ کچھ درخت جو انھیں نہیں مل رہے تھے اب بنجاروں کی مدد سے مل گئے تھے۔ درختوں کا سلسلہ بہت دور سے شروع ہوتا اور ہر درخت آندھی کی گرد کے لیے چھلنی کا کام کرتا اور آخری درخت تک آتے آتے گرد غائب ہو جاتی، صرف ہوا رہ جاتی، وہ بھی بہت تیز نہیں۔ ایسا ان کا کہنا تھا۔

”اس دن آندھی دو دن پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ابو اسی آندھی میں چھوٹے صاحب کے ساتھ باہر نکل گئے اور آپ والے درخت سے ناپ ناپ کر دوسرے درختوں کی جگہ پر نشان بنا رہے تھے۔ اچانک اُن کے گردے میں، شاید گردے ہی میں، ایسا شدید درد اٹھا کہ وہ وہیں کے وہیں ختم ہو گئے۔“

اس کے بعد وہ کچھ دیر چپ رہی، میں بھی چپ رہا۔ پھر اس نے کہا، ”امی اس کے بعد خاموش رہنے لگیں۔ باتیں بہت کم کرتی تھیں۔ لیکن ایک رات چھوٹے صاحب نے خواب میں زرد آندھی آتی دیکھی۔ سویرے اٹھے تو دہشت زدہ تھے۔ اس دن معلوم ہوا کہ وہ زرد آندھی، بلکہ شاید رنگین آندھی سے ڈرتے ہیں۔ ان کا ڈر دور کرنے کے لیے امی نے آپ کے آندھی میں گھومنے کے کئی قصے سنائے اور چھوٹے صاحب کا خوف جاتا رہا۔ بلکہ وہ آپ کا ذکر اس طرح کرنے لگے جیسے ان سے آپ کی پرانی ملاقات ہو۔

”چھوٹے صاحب کا خوف دور کرنے کی کوشش میں امی نے آپ کے یہاں اپنی مہمانیوں کو اور آپ کی والدہ کو اس طرح اور اتنی دیر تک یاد کیا کہ بیمار ہو گئیں اور کچھ دن بعد سوتے میں خاموشی کے ساتھ گزر گئیں۔ اگر مختار ماموں نہ ہوتے تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو؟“ مجھے مختار صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ معلوم نہیں کس وقت آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ”کیوں یہ سب سوچتی ہو؟“

”چھوٹے صاحب کے لیے ابو کے بعد امی کا صدمہ بہت بڑا تھا لیکن انھوں نے خود کو سنبھال لیا اور درختوں کے کام میں لگ گئے،“ ملیکہ نے کہا، ”لیکن...“ اس کی آواز رک گئی، ”مختار ماموں، آپ بتا دیجیے۔“

”بار بار پوچھ کر کڑھنے سے کیا فائدہ، بیٹی،“ مختار صاحب نے خاندان کے بزرگ کی طرح کہا، ”کتنی بار تو سن چکی ہو۔ انھیں معلوم ہے کہ چھوٹے صاحب درخت سے گر کر...“

”ایک بار پھر بتائیے۔ آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔“

”بتاتا ہوں، لیکن رونے نہ لگنا۔ تمھاری صحت کو نقصان پہنچے گا۔“

”اب کہاں روتی ہوں۔“

”ضبط کرتی ہو۔ وہ اور بھی نقصان کرتا ہے،“ مختار صاحب نے بتانا شروع کیا، ”خیر، تو چھوٹے صاحب نے پھر بڑے صاحب کا چھوڑا ہوا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے گڈھے ٹھیک کرائے جو بڑے صاحب کے بعد بھر چلے تھے۔ پھر آپ کے درخت کی شاخوں...“

”یہ آپ لوگ اسے میرا درخت کیوں کہنے لگے ہیں؟“ میں نے زرا الجھ کر ان کی بات کاٹی۔

”آپ اس کے نیچے رہتے ہیں نا؟“ ملیکہ نے کہا۔ ”اس کے نیچے کوئی اور نہیں رہتا۔ پھر اس کا نام بھی کسی کو نہیں معلوم۔“

مختار صاحب بولے، ”چھوٹے صاحب نے پھر اس کی شاخوں کی سیدھ لے لے کر سب درختوں کی جگہیں مقرر کیں۔ اس وقت وہ بہت خوش تھے۔ اور ایک بار پھر پورے منظر کا جائزہ لینے کے لیے درخت کے اوپر چڑھ گئے۔ سب نے انھیں منع بھی کیا۔ لیکن اتنی دیر میں وہ اس کی نچلی شاخ پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے انھیں گرتے دیکھ لیا لیکن مجھے پتا نہیں چلا کہ وہ سر کے بل گرے ہیں، پھر وہ بہت اونچائی سے نہیں گرے تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ’ملیکہ‘ اور وہ ہنستے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں احتیاطاً انھیں پکڑا کر لارہا تھا کہ اچانک وہ گر گئے۔ کانوں سے خون بھی بہنے لگا اور وہ بالکل بے ہوش ہو گئے۔ فوراً شہر کے ہسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ اس کے بعد سے جو علاج ہوئے آپ کو پتا ہے۔“

کچھ دیر بعد بلم ملکہ کو سلام کرنے آیا۔ باتوں باتوں میں ملکہ نے اس سے پوچھا، ”چھوٹے صاحب کو نہیں دیکھو گے؟“

”اسی لیے تو ہم آئے ہیں۔“

ملکہ نے مجھ سے کہا، ”آپ بھی انھیں دیکھ لیجیے۔ ہم نے رات کو انھیں خواب میں دیکھا تھا۔ خیال ہوا کہ آج شاید ان کو ہوش آئے۔“

”خوابوں کا بھروسہ نہیں،“ میں نے سوچا اور بلم، مختار صاحب اور ملکہ کے ساتھ بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ اور وہاں میں نے اس شخص کو دیکھا جو مجھ کو اپنا دوست کہتا تھا اور جسے میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا ہے اور کچھ ہے بھی یا نہیں۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے پکارا، ”چھوٹے صاحب!“ پھر اس کے نتھنوں پر ہاتھ رکھا، اس کے پوٹوں کو آہستہ سے کھولا اور بند کیا، اس کے کان کی لووں کو دیکھا۔ میں کسی ماہر معالج کی طرح مریض کا معائنہ کر رہا تھا لیکن اس سے میرا مقصد کچھ معلوم کرنا نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن سب لوگ مجھے ایسی امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ مجھے اپنا انارٹی پن ظاہر کرنا بے رحمی کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ معائنے کے دوران میں نے بار بار اسے پکارا۔ ہر پکار پر سب تھوڑا آگے جھک کر کبھی چھوٹے صاحب کو، کبھی مجھ کو دیکھنے لگتے تھے لیکن چھوٹے صاحب جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ مجھ کو وہاں ایک اجنبی شخص بھی نظر آیا۔ وہ دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے غور سے دیکھا۔ سردار تھا۔ اس وقت قاعدے کا صاف ستھرا لباس پہن کر چھوٹے صاحب کو دیکھنے آیا تھا۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی اور خاموشی کے

ساتھ گردن جھکائے پلٹ گیا۔

میں نے معائنہ ختم کیا اور مختار صاحب سے پوچھا، ”کبھی کچھ بولتے بھی ہیں؟“

”وہی ایک پکارِ ملکیت، جو ان کے ہونٹوں پر درخت سے گرتے وقت تھی۔“

”میں اس پکار کا مطلب سمجھتی ہوں،“ ملکیت بولی۔ ”کہتے ہیں اس درخت کو رہنے دینا۔“ پھر مجھ سے

پوچھا، ”آپ نے ان کو دیکھ لیا؟ یہ ٹھیک ہو جائیں گے؟“

”مجھ سے پوچھ رہی ہو، ملکیت؟“ میں نے دل ہی دل میں کہا، مجھے اپنی وہ عزیزہ یاد آگئی تھیں جو

جھولے پر سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ پھر بیس پچیس سال تک ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ ان کے داڑھی

مونچھیں نکل آئی تھیں اور چہرہ بھیا نک ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا صرف ذکر سنا تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ

یا بہت کچھ مبالغہ ہو۔ میں نے ان کا خیال ذہن سے نکال دیا اور ملکیت کو جواب دیا، ”ٹھیک بھی ہو سکتے ہیں۔

نظاہر انھیں کوئی مرض نہیں ہے۔“

پھر اچانک میرا دل دھول بن سے اچاٹ ہو گیا۔ میں سوچنے لگا یہاں کیوں پڑا ہوں۔ دنیا مجھے ویسی

ہی معلوم ہونے لگی جیسی اپنا گھر چھوڑتے وقت معلوم ہوئی تھی۔ ابھی خا صا دن باقی تھا۔ میں نے درخت کے

نیچے جا کر اپنا سامان اکٹھا کیا۔ آخری بار اس درخت کو دیکھا۔ ملکیت، مختار صاحب، سردار، چودھری کسی سے

بھی رخصت نہیں ہوا بستی کے باہر چھوٹے چھوٹے گڈھوں سے بچتا ہوا دور نکل آیا اور کسی نئی شہری آبادی کی

تلاش میں چل پڑا۔ □

لکھنو

۹ مئی ۲۰۱۰